مولانا ابوالحسن علی ندوی اور قادیانیت

حکیم محمود احمد ظفر (سیالکوٹ)

مسئلہ ختم نبوت ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے اور بے شمار آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ اس پر شاہد عادل ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے۔

قد اخبر الله تبارک وتعالی فی کتابه ورسوله ﷺ فی السنة المتواترة عنه انه لا نبی بعده

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴)

آپ کے ''خاتم النبیین'' ہونے کی اس امتیازی شان کی وجہ سے وہ دین جو سیدنا آدمؑ سے شروع ہوا تھا وہ آپؐ کی ذات ستودہ صفات پر پایہ تکمیل کو پہنچا اور یہ اعلان کیا گیا:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً"

یعنی آج کے دن تمہارا دین میں نے تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا ہے۔

یہاں دین کی تکمیل کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے۔ ایک ''کمال'' اور دوسرا ''تمام'' یہ دونوں الفاظ نقصان کے مقابلے میں ہیں، لیکن دونوں میں فرق ہے۔ ''کمال'' اوصاف خارجیہ کے نقصان کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔ جب کہ ''تمام'' اجزاء کے لحاظ سے مکمل ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسے کسی شخص کی ایک ٹانگ نہ ہو تو وہ شخص ناتمام اور ناقص ہے، خواہ کتنا ہی حسین وجمیل کیوں نہ ہو اور اگر اس کے تمام اجزاء اور اعضاء پورے اور مکمل ہوں، لیکن صورت اچھی نہ ہو، اخلاق بگڑے ہوئے ہوں، خصائل درشت اور ناہموار ہوں، تو ایسے شخص کو بجائے ناتمام کے نامکمل انسان کہا جائے گا۔ آیت بالا میں

ان دونوں لفظوں کو جمع کر کے یہ بتایا گیا کہ اب دین اسلام اوصاف خارجیہ اور تمام اجزاء کے لحاظ سے مکمل اور تمام ہے۔ اب اس میں کسی قسم کے ارتقاء کی ضرورت نہیں۔ اسی وجہ سے اب کسی نبوت کی کوئی ضرورت نہیں، لہذا آپؐ کی بعثت آخری رسول کی بعثت ہے اور آپ قصر نبوت کی آخری اینٹ ہیں اور اب قصر نبوت پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے۔ پہلی نبوتیں خاص خاص قوموں اور خاص زمانہ کے لئے تھیں، لیکن آپؐ کی نبوت پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ اور اب قیامت تک کے لیے نبوت ورسالت کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔

آپؐ چونکہ خاتم النبیین ہیں، اس وجہ سے آپؐ میں نبوت ورسالت کے لحاظ سے جو اوصاف اور خصائل وشمائل تھے، ان میں بھی آپ خاتم ہیں۔ اس لحاظ سے آپ ''خاتم الاخلاق'' بھی ہیں ''خاتم العلوم'' بھی ہیں اور آپؐ خاتم الرحمت بھی ہیں۔ اب کوئی درجہ نبوت کا باقی نہیں رہا کہ آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آئے۔ اس لئے نہ تو اب نبوت کی ضرورت ہے اور نہ ہی شریعت کی، کیونکہ آپؐ کی شریعت بھی ''خاتم الشرائع'' ہے اور آپؐ کا دین بھی ''خاتم الادیان'' اور آپؐ کی کتاب بھی ''خاتم الکتب'' یعنی ہر شے کا انتہائی درجہ آپؐ کو عطا کیا گیا۔

ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ نبوت منقطع ہوگئی، بلکہ ''ختم نبوت'' کا مطلب ''تکمیل نبوت'' ہے، یعنی نبوت کامل ہوگئی اور کسی شے کی مکمل ہونے کے بعد کوئی درجہ باقی نہیں رہتا کہ وہ آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے رات کا وقت ہے اور ستارے چمکنا شروع ہوئے۔ غروب آفتاب کے بعد ایک ستارہ چمکا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، اور پھر ہزاروں اور کروڑوں ستارے چمکے کہ سارا آسمان جگمگا اُٹھا۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اور چاند بھی اپنے پورے وجود اور پوری روشنی کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ چاند اور کروڑوں ستارے اپنی پوری روشنی پھیلا رہے ہیں، لیکن رات کا اندھیرا نہیں جا رہا۔ جب

تک دن نہیں ہوتا فضا میں وہ چمک دمک پیدا نہیں ہوتی جو دن میں ہوتی ہے۔

جونہی رات گزری اور آفتاب نکلنے کا وقت ہوا۔ ابھی نکلا نہیں صرف پو پھٹی تھی۔ پس صبح صادق نے اطلاع دی کہ آفتاب آرہا ہے۔ یہ خبر آئی تھی کہ اندھیرا غائب ہونا شروع ہو گیا اور دنیا میں اُجالا ہو گیا۔ ایک ہی ستارے (آفتاب) نے سارے آسمان، بلکہ ساری فضا کو چمکا دیا، یعنی وہ تو کروڑوں اربوں مل کر روشنی پھیلا رہے تھے، لیکن رات کے اندھیرے کو زائل نہ کر سکے اور رات کی رات ہی رہی اور اب صرف ایک ستارہ (آفتاب) نکلا۔ اس نے آکر ساری رات کو دھکیل باہر کیا اور پورے عالم میں اجالا ہو گیا۔ اب اگر آفتاب یوں کہے کہ میں ''خاتم الانوار'' ہوں، میں نے سارے انوار کو ختم کر دیا اور سارے انوار میری ذات پر ختم ہیں۔ میرے آنے کے بعد اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں۔ جو موجود تھے ان کا نور بھی ماند پڑ گیا۔ دن کے وقت بھی وہ موجود ہیں لیکن آفتاب کی روشنی میں وہ نظر نہیں آتے۔ اب وہ نمایاں ہونے کے قابل نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آفتاب نے ستاروں کا نور چھین لیا۔ وہ تو منور ہیں، لیکن آفتاب کی تیزی اور چمک کے سامنے ان کی چمک ماند ہے۔ ایسے وقت میں آفتاب کے اس کہنے کا میں ''خاتم الانوار'' ہوں، یہ مطلب ہوگا، کہ سارے انوار اور چمکیں مجھ پر ختم ہو گئیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اب نور کا کوئی ایسا درجہ باقی نہیں ہے کہ کوئی اور ستارہ آئے اور نور پھیلائے۔ اب دن کے ختم ہونے تک میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اب کسی اور ستارے کی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ دن ہی ختم ہو جائے اور یہ جہاں ہی ختم ہو جائے، یہ الگ بات ہے۔ تو کیا آفتاب کے خاتم الانوار کہنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا سے نور مٹ گیا اور اندھیرا چھا گیا، یا یہ مطلب ہوگا نور کے ختم ہونے کا کہ نور کے تمام مراتب ختم ہو گئے، یعنی کامل اور مکمل ہو گئے۔ اب کسی دوسرے ستارے کی ضرورت نہیں، کسی دوسری چمک کی حاجت نہیں۔ معلوم ہوا کہ ختم الانوار کا مطلب قطع الانوار نہیں، بلکہ تکمیل انوار ہے۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ نبوت ایک آسمان ہے۔ اس پر سب سے پہلے نور کا ستارہ سیدنا آدم علیہ السلام کا چمکا۔ اس کے بعد سیدنا نوح علیہ السلام کے نور کا ستارہ چمکا۔ پھر سیدنا ابراہیم، سیدنا اسحاق، سیدنا یعقوب، سیدنا یوسف، پھر سیدنا صالح، پھر سیدنا شعیب، پھر سیدنا موسیٰ، پھر سیدنا داؤد، پھر سیدنا سلیمان اور پھر سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ستارے باری باری آسمان نبوت پر چمکتے رہے اور ''ثم ارسلنا رسلنا تترا'' پھر پے در پے انبیاء علیہم السلام آنے شروع ہوے، یعنی باری باری سب پیغمبر آرہے ہیں۔ گویا آسمان نبوت ستاروں سے بھر گیا لیکن دنیا میں چاند ماند ہوا، دن نہ نکلا بلکہ رات ہی رہی، اندھیرا پورے طور پر کافور نہ ہوا،

پھر آخر فاران کی چوٹیوں سے آفتاب نبوت نے طلوع ہوا اس ہوتے ہی اعلان کیا کہ اب میں آگیا ہوں۔ اب کسی ستارے کی ضرورت نہیں۔ میرا نکلنا ہی کافی ہے۔ پوری دنیا، بلکہ پوری کائنات کے لئے اب میں کافی ہوں، میں خاتم النبیینؐ ہوں، نبوت ختم ہوگئی، یعنی مراتب نبوت میری ذات پر ختم ہوگئے۔ کامل اور مکمل ہوگئے۔ اب کسی کو نبی بنا کر نہیں بھیجا جائے گا۔ گویا جب تک یہ دنیا قائم ہے، میں آفتاب ہوں، میرا نور ہی کافی ہے۔

علامہ انور شاہؒ اور ختم نبوت

مسئلہ ختم نبوت کی کچھ تفصیل اس لیے دی گئی تاکہ یہ پتہ چلے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اس بارے میں جو کام کیا وہ کتنا اہم تھا اور جس وقت انہوں نے اپنی کتاب لکھی اس وقت اس کی کس قدر ضرورت تھی۔ امت میں ختم نبوت کا عقیدہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آسکتا، گذشتہ چودہ سو سال سے چلا آرہا تھا اور تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع تھا، لیکن ۱۹۰۰ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے دعوے نبوت کیا، جس سے ہندوستان کے علمائے کرام میں ایک اضطراب پیدا ہوا، لیکن علماء میں

جس قدر مضطرب علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ ہوئے، اتنا شاید ہی کوئی اور مضطرب ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے اس فتنہ کی سرکوبی کا مصمم ارادہ کرلیا۔ آپ نے ایک طرف تو ملک کے عظیم مفکر اور شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبالؒ کو اس فتنہ کی سنگینی کی طرف متوجہ کیا، جنہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ پڑھے لکھے طبقہ کو اس فتنہ سے خبردار کیا اور اس کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا، یہ نکتہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ان کے ذہن میں ڈالا تھا۔

دوسری طرف سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور دوسرے علماء کو اس کام پر لگایا کہ وہ برصغیر پاک و ہند میں لوگوں کے ذہنوں میں مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کو واضح کریں تاکہ وہ انگریز کے اس خود کاشتہ پودا کا سیاسی محاسبہ کریں۔ چنانچہ ان علماء نے اس فتنہ کبریٰ کے استیصال کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔

حضرت علامہ انور شاہؒ اس فتنہ کے اس قدر مخالف تھے کہ ۱۹۲۹ء میں ریاست بہاول پور میں قادیانیوں کے کفر و اسلام کے بارہ میں ایک مقدمہ چلا۔ اس کے لیے حضرت مولانا غلام محمد گھوٹویؒ خلیفہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ اور حضرت مفتی محمد صادقؒ نے حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کو اس مقدمہ میں بیان دینے کے لیے دیوبند سے بلوایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان دنوں بواسیر کے مرض میں سخت مبتلا تھے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے حضرتؒ کو سفر سے بالکل روک دیا تھا، کمزوری بہت تھی، لیکن جونہی حضرت شاہ صاحبؒ کو ان دونوں حضرات کی دعوت پہنچی تو آپ سفر کے لیے تیار ہوگئے۔ بہاول پور سے مفتی محمد صادق صاحبؒ آپ کو خود لینے دیوبند گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر قیامت کے روز سرکار دو عالم ﷺ نے یہ سوال کرلیا کہ میری ختم نبوت کا مقدمہ عدالت میں پیش تھا اور تجھے طلب کیا گیا اور تو نہیں گیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ موت تو بہرصورت آنی ہے اگر اس راستہ میں آگئی تو اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی۔ چنانچہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے منع کرنے کے باوجود آپ تشریف لے گئے۔ آپ نے

عدالت میں کرسی پر بیٹھ کر مرزا غلام احمد کے کفر پر دلائل دیئے۔ آپ کے دلائل پر قادیانیوں کی طرف سے جرح ہوتی رہی اور حضرت شاہ صاحبؒ جواب دیتے رہے۔ شاہ صاحبؒ کے بیان اور جرح کے اختتام پر آپ نے قادیانی نمائندہ جلال الدین شمس کا ہاتھ پکڑا اور بڑے جوش سے فرمایا: ''جلال الدین اگر اب بھی تمہیں مرزا قادیانی کے کفر میں شبہ ہو تو آؤ میں تمہیں اسے جہنم میں جلتا ہوا دکھاؤں''۔ یہ سن کر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگا: اگر آپ مجھے اسے جہنم میں جلتا ہوا دکھا بھی دیں تو میں کہوں گا کہ یہ استدراج ہے۔

مقدمہ کی سماعت کے بعد جب حضرت شاہ صاحبؒ واپس دیوبند جانے لگے تو مولانا مفتی محمد صادق صاحبؒ اور دیگر علماء کو فرمایا کہ مقدمہ کا فیصلہ اگر تو میری زندگی میں ہو گیا تو میں خود سن لوں گا، اگر یہ فیصلہ میری وفات کے بعد ہوا تو میری قبر پر آ کر سنا دینا۔ چنانچہ بہاول پور سے واپسی پر آپ کی جلد وفات ہو گئی اور یہ فیصلہ آپ کی وفات کے بعد ہوا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد صادق صاحبؒ دیوبند گئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کی قبر پر کھڑے ہو کر یہ فیصلہ سنایا۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا۔ عدالت کے سیشن جج محمد اکبر صاحب نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ کو اس فتنہ کے بارہ میں کتنی فکر تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک اور واقعہ بھی منقول ہے کہ وفات سے چند روز قبل جب کہ آپ کو بیماری کی وجہ سے سخت کمزوری لاحق تھی۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے دار العلوم دیوبند کی مسجد میں پہنچایا جائے۔ چنانچہ ایک پالکی لائی گئی اور اس میں بٹھا کر آپ کو مسجد پہنچایا گیا اور آپ کو محراب میں بٹھا دیا گیا۔ حضرتؒ کی آواز انتہائی نحیف تھی اور آپ کے تمام اجل شاگرد آپ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے اس وقت دو باتیں فرمائیں۔ پہلی بات یہ فرمائی کہ جہاں تک تاریخ اسلام کا میں نے مطالعہ کیا ہے اسلام میں

چودہ سو سال میں جس قدر فتنوں نے جنم لیا ان میں قادیانی فتنہ سب سے زیادہ خطرناک اور سنگین ہے اور دوسری بات یہ فرمائی کہ سرکار دو عالم ﷺ کو جتنی خوشی اس شخص سے ہو گی جو اس فتنہ کے استیصال کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے، یعنی سرکار دو عالم ﷺ اس کے دوسرے اعمال کی نسبت اس کے اس عمل سے زیادہ خوش ہوں گے۔ پھر جوش میں آ کر فرمایا کہ جو کوئی اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے یا اس فتنہ کے استیصال کے لیے اپنے آپ کو لگا دے اس کی جنت کا میں ضامن ہوں۔ اندازہ فرمائیے کہ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اور اس فتنہ کی سرکوبی کی فکر ہے۔ وفات کے وقت آپ نے اپنے شاگردوں کو بھی اس فتنہ کی سرکوبی کی وصیت فرمائی۔

مولانا علی میاںؒ کا اس فتنہ کی سرکوبی میں حصہ

حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ سے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو نسبت ارادت تھی اور حضرت رائے پوریؒ کو بھی آپ سے بڑی محبت تھی۔ حضرت رائے پوریؒ کو اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی وصیت بھی یاد تھی، لیکن آپ عمر کی ان منزلوں میں تھے کہ ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ اس کے علاوہ ارادت مندوں کی آمد و رفت کی وجہ سے مصروفیت بھی کچھ زیادہ تھی، لیکن اس فتنہ کے استیصال کا داعیہ آپ کے قلب میں موجزن تھا۔ چنانچہ آپ نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو حکم فرمایا کہ قادیانیت کے فتنے سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے عربی زبان میں ایک کتاب زیب رقم کی جائے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ خود اس کتاب کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> ''دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے اوائل میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں مجلس مذاکرات اسلامی (اسلامک کلوکیم) کا انعقاد ہوا جس میں عالم اسلام اور مغربی ممالک کے بہت سے ممتاز و نامور اہل علم اور اہل فکر نے شرکت کی۔ خاص طور پر مشرق اوسط کے

سربرآوردہ علماء نے اپنے ملک کی نمائندگی کی۔مجلس مذاکرات کے ناظم وداعی کی طرف سے دعوت وصول ہونے کے باوجود راقم سطور ان تاریخوں میں نہیں پہنچ سکا۔مجلس کے اختتام کے بعد ہی جب لاہور پہنچا تو مجلس اس تذکرہ سے گرم تھیں۔خصوصیت کے ساتھ مصروشام کے نمائندوں نے شریعت اسلامی کی جو پرزور وکالت اور اپنی دینی حمیت کا جوشاندار مظاہرہ کیا تھا،اس کا اعتراف اور تذکرہ عام تھا.

اس مجلس میں شرکت کے لیے مصروشام وعراق کے جوعلماء اور اساتذہ آئے تھے انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی مشہور مذہبی تحریک قادیانیت اور اس کے اساسی عقائد وخیالات کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ان کی یہ جستجو اور تحقیق کا شوق بالکل حق بجانب اور قدرتی امر تھا۔اسی سرزمین میں تحریک کا ظہور اور نشوونما ہوا اور یہیں سے اس کے متعلق مستند معلومات اور مواد حاصل ہوسکتا ہے۔اس موقع پر ان کے پاکستانی وہندوستانی دوستوں کو اس خلا کا شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ ان کو پیش کرنے کے لئے عربی میں جدید طرز کی کتاب موجود نہیں۔اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ میں جب لاہور پہنچا تو میرے شیخ ومربی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری مدظلہ نے اس موضوع پر عربی میں ایک مکمل کتاب کی تالیف کا حکم دیا (مقدمہ کتاب قادیانیت،ص ۷-۸)

حضرت رائے پوریؒ نے اس کام کے لئے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب فرمایا مولانا علی میاںؒ اس میدان کے شہسوار تھے۔ماں کے پیٹ سے علم کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے۔عربی ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔عمر تحریر وتقریر کے دشت کی سیاحی میں گزری،ان کی عربی

تحریر کو سید قطب جیسے ادیب بھی مانتے تھے۔ عربی کے قدیم اور جدید دونوں اسلوب سے واقف و آشنا تھے، لیکن قادیانیت کے مطالعہ سے آپ کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ موضوع آپ کی افتادِ طبع اور ذہنی تربیت کے یک قلم خلاف تھا۔ اگر چہ آپ کے بچپن میں برصغیر پاک و ہند کے قریباً ہر شہر میں قادیانیوں سے مسلمان علماء کے مناظرے ہوتے تھے، لیکن آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ان مناظرانہ بحثوں سے یک قلم دور تھا۔ چنانچہ مولانا علی میاںؒ لکھتے ہیںؒ:

> ''مشرق اوسط کی سیاحت اور مصر و شام کے قیام کے دوران میں اگر چہ بارہا اس ضرورت کا خود احساس ہوا تھا، لیکن اس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ موضوع افتادِ طبع اور اس وقت تک کی ذہنی تربیت کے خلاف تھا۔ مصنف کا ذوق اس وقت تک قادیانی لٹریچر اور خود مرزا صاحب کی تصنیفات کے مختصر سے مختصر حصہ کا مطالعہ کرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا، اور وہ اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا''
> (مقدمہ کتاب قادیانیت ص ۸)

مولانا رائے پوریؒ نے آپ کو کیوں حکم فرمایا؟ اس کی وجہ بھی مولانا علی میاںؒ نے لکھی ہے، فرماتے ہیں:

> ''حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کو جو اس زمانہ میں لاہور میں مقیم تھے اور جن کو قادیانیت میں اسلام کے لیے وہ خطرہ محسوس ہوتا تھا، اور اس سے ان کی طبیعت کو ایسا اباء اور توحش تھا جو شاید مولانا محمد علی مونگریؒ اور مولانا انور شاہ صاحبؒ کے بعد علماء و مشائخ میں سے کم تر کسی کو رہا ہو، میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ حضرتؒ کو شدت سے میرا انتظار تھا اور فرما رکھا تھا کہ میں اس کام کی تکمیل کے لیے اس سے

اصرار کروں گا۔ میں حاضر ہوا تو مجھے اس موضوع پر عربی میں ایک کتاب کی تالیف کا حکم دیا۔ مجھے پہلے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے میرے سر پر پہاڑ رکھ دیا کہ میں اس کوچہ سے یکسر نا بلد تھا۔ میں نے اس وقت تک کوئی کتاب پڑھی تھی نہ ان کی تردید میں کچھ دیکھا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جب پاکستان میں ختم نبوت کی تحریک چل رہی تھی اور مارشل لاء نافذ تھا اس وقت میں نے عربی میں ایک مضمون ''القادیانیۃ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیہ'' کے عنوان سے لکھ کر مصر وشام اور عراق کے دوستوں اور بزرگوں کے پاس بھیجا تھا، جس کو ان حضرات نے مصر وشام وکویت میں بھی شائع کرا دیا تھا، اور رابطہ عالم اسلامی نے بھی اس کو بہت بڑی تعداد میں شائع کیا، لیکن وہ ایک سرسری جائزہ تھا جس کا ماخذ اردو کے چند رسائل تھے (کاروانِ زندگی ۱: ۴۴۸)

مولاناؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رائے پوری چونکہ حضرت علامہ انور شاہؒ کے شاگرد تھے، اس وجہ سے ان کے اندر دراصل علامہ انور شاہؒ کی روح بول رہی تھی۔ وہ علامہ مرحوم کی طرح اس فتنہ کو اسلام کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتے تھے، اس وجہ سے وہ عرب علماء کو اس فتنہ کی سنگینی سے متعارف کرانے کے لیے جدید ذہن کو سامنے رکھ کر شیریں اور فصیح عربی میں مولانا علی میاںؒ سے ایک کتاب لکھوانا چاہتے تھے جس سے اس فتنہ کو عرب ممالک میں اجاگر کر کے لوگوں کو اس کے جراثیم سے محفوظ رکھا جائے، کیوں کہ قیام پاکستان کے بعد ظفر اللہ خان قادیانی کے وزیر خارجہ ہونے کی وجہ سے قادیانی عرب ممالک میں بھی اپنی اس تحریک کو روشن کرا کر عوام الناس کو اپنے دام فریب لانا چاہتے تھے۔ اس لیے حضرت رائے پوریؒ کو یہ فکر تھی عرب عوام وخواص کو اس فتنہ کے اصل چہرہ سے آشنا کرایا جائے جو اس زمانہ میں کتاب کے ذریعہ ہوسکتا تھا۔ اس

وجہ سے آپ کا اصرار تھا کہ مولانا علی میاںؒ اس موضوع پر ایک کتاب لکھیں۔ مولانا نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لینے کی کوشش کی، چنانچہ خود لکھتے ہیں:

''میں نے پہلے تو عرض کیا کہ چونکہ میں عربوں کے ذہن اور عالم عرب کے طریق فکر سے واقف ہوں، اس لیے کتاب کا خاکہ بنا دوں گا، بہتر ہے کہ مولانا محمد یوسف بنوریؒ جو بلند مرتبہ عالم، محدث اور عربی لکھنے پر ہر طرح قادر ہیں، وہ اس کام کو انجام دیں، لیکن شاید حضرتؒ کی توجہ قلبی کا نتیجہ تھا کہ میرا ذہن خود بدل گیا۔ میں نے اس کام کی ذمہ داری لے لی'' (کاروان زندگی، جلد ا: ۴۴۸)

جونہی مولانا علی میاںؒ نے کتاب لکھنے کی آمادگی ظاہر کی حضرت رائے پوریؒ نے تحفظ ختم نبوت والوں کو قادیانی لٹریچر فراہم کرنے کے لیے کہا۔ حضرت مولانا محمد حیات صاحبؒ، قاضی احسان احمد صاحبؒ شجاع آبادی اور مولانا لعل حسین اخترؒ اور دیگر حضرات قادیانی لٹریچر لے کر حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بس پھر کیا تھا'' چند ہی دن میں قیام گاہ کا ایک کمرہ قادیانی لٹریچر کا کتاب خانہ اور دار التصنیف بن گیا''۔

مبلغین ختم نبوت نے چند روز میں مولانا علی میاںؒ کو قادیانی تحریک کے خدوخال سے آگاہ کر دیا اور مرزا غلام احمد قادیانی نے کس طرح بتدریج مختلف دعوے کیے اور آخر کار دعویٰ نبوت کیا، ان سب باتوں سے آشنا ہو کر اس کی ایک ترتیب ذہن میں رکھ کر حضرت مولاناؒ نے اپنے کام کا آغاز کیا اور ایک ماہ کے اندر عربی زبان میں قادیانی فتنہ کے بارے ایک بہترین کتاب، مناظرانہ انداز میں نہیں، بلکہ تحقیقی انداز میں تیار ہو گئی جس کا نام ''القادیانی والقادیانیہ'' رکھا گیا۔

چنانچہ مولانا علی میاںؒ خود لکھتے ہیں:

''مصنف کا ذہن چونکہ فطرتاً تاریخی واقع ہوا ہے۔ اور وہ اس شہر میں

بالکل نو وارد تھا، اس لیے اس نے اپنا سفر تحریک کے آغاز سے شروع کیا اور اس کی نشو ونما اور ارتقاء کے ایک ایک مرحلہ کا جائزہ لیتا ہوا چلا ۔ گویا اس کے مشاہدات اور معلومات تحریک کی طبعی نشو ونما کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ۔ اس طرز مطالعہ نے تحریک کی فطرت ومزاج اور اس کے تدریجی ارتقاء اور اس کے مضمرات کے سمجھنے میں بڑی مدد دی اور بعض ایسے حقائق کا انکشاف کیا جو اس تحریک کو ایک مکمل شکل میں دیکھنے سے ظاہر نہیں ہو سکتے ۔ مصنف نے مرزا غلام احمد صاحب کی تصنیفات کا براہ راست مطالعہ کیا اور انہیں کے ذریعہ ان کی دعوت وتحریک اور نظام کو سمجھنے اور ایک غیر جانب دار مؤرخ اور طالب حق کی طرح آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کی ۔ اس مطالعہ وجستجو کا نتیجہ وہ عربی کتاب تھی جو ''القادیانی والقادیانیة'' (مرزا غلام احمد اور ان کی تحریک قادیانیت) کے نام سے شائع ہو چکی ہے ۔ (مقدمہ کتاب قادیانیت، ص ۹)

یہ کتاب آپ نے کتنے دنوں میں لکھی ۔ اس بارہ میں مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب ''کاروان زندگی'' میں لکھا ہے:

''میں نے ایک مہینہ صوفی عبد الحمید صاحب مرحوم (سابق وزیر پنجاب) کی کوٹھی میں جہاں حضرت (رائے پوریؒ) کا قیام تھا، اس علمی اور تصنیفی اعتکاف میں اس طرح گزارا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی، مرزا صاحب کی تمام کتابیں پڑھیں ۔ نوٹس (Notes) لیے، تقریباً ۲۳-۲۴ دن میں ''القادیانی والقادیانیة'' کے نام سے کتاب تیار ہوگئی (کاروان زندگی ۱: ۳۴۹)

گویا کتاب جنوری ۱۹۵۸ء میں پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ ۲۳۔۲۴ روز میں ایک تحقیقی کتاب لکھنا ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس سے حضرت مولانا علی میاںؒ کی زود نویسی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مناظرانہ ومتکلمانہ زبان اور اسلوب میں نہیں لکھی گئی، بلکہ یہ مؤرخانہ متانت سے لکھی گئی۔ اور نبوت کا درد دل رکھ کر لکھی گئی کہ یہ فرقہ قادیانی امت سے کٹ کر جہنم کے راستہ پر گامزن ہوگیا ہے۔ مولانا علی میاںؒ چونکہ مدت سے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے ساتھ کام کرتے رہے تھے، اس وجہ سے وہی تبلیغی انداز اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہے جس نے نہ صرف اپنوں کو، بلکہ بیگانوں کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ قادیانیوں کے اخبار ''الفضل'' نے اس کتاب کے اردو ترجمہ پر ریویو کرتے ہوئے لکھا۔

> ''اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ پوری کتاب (اس موضوع کی دوسری کتابوں کے برخلاف) متین اور شائستہ زبان میں لکھی گئی ہے صرف اس کا نام قابل اعتراض اور اشتعال انگیز ہے (کاروان زندگی، ۱:۴۴۹)

حضرت مولاناؒ کا چونکہ ذہن مناظرانہ اور طنز وتشنیع والا نہیں تھا، اس لئے آپ نے متانت وسنجیدگی کا دامن پوری کتاب میں اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حضرت مولاناؒ نے کتاب میں قادیانیت کے خلاف جو مواد ترتیب دیا اس میں قادیانیت سے کراہت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مولانا علی میاںؒ نے اس بات کا خود اعتراف فرمایا:

> ''مصنف نے اس کا بھی لحاظ رکھا کہ جس غصہ اور کراہت کا اظہار وہ اپنے قلم سے کرسکتا ہے وہ قارئین کے دل میں کتاب کے مواد سے خود پیدا ہو۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی نے میثاق میں اس پر تبصرہ

کرتے ہوئے لکھا۔ مصنف پر تعجب آتا ہے کہ جہاں اس کو غصہ آنا چاہیے وہاں بھی ان کو غصہ نہیں آیا (کاروان زندگی، ۱: ۴۴۹)

حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> مناظرانہ ومتکلمانہ مباحث کی ہندوستان کے دور آخر میں خاص زبان اور خاص اسلوب تحریر بن گیا ہے جس کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مصنف نے اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی ۔ اس کتاب میں مناظرانہ جوش کے بجائے مؤرخانہ متانت زیادہ ملے گی اور جو لوگ مناظرانہ وفریقانہ کتابوں کے ایک خاص طرز اور لہجہ کے عادی ہیں، شاید ان کو اس کتاب کو پڑھ کر مایوسی اور شکایت ہو، لیکن مصنف ان کے لیے معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس نے یہ کتاب جس طبقہ اور جس مقصد کے لئے لکھی ہے اور جو معیار اس کے لئے مقرر کیا ہے، اس کے لیے یہی طرز مناسب تھا'' (مقدمہ کتاب قادیانیت، ص ۱۰)

اصل کتاب تو عربی میں لکھی گئی تھی جس سے صرف اہل عرب یا عربی جاننے والے حضرات مستفید ہو سکتے تھے، عوام اور دوسرے وہ تمام حضرات جو عربی سے ناآشنا تھے، ان کا اس کتاب سے استفادہ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ حضرت رائے پوریؒ نے اس کا اردو ترجمہ کرنے کا حکم مولانا علی میاںؒ ہی کو دیا، حالانکہ دوسرے حضرات بھی اس کا ترجمہ کر سکتے تھے، لیکن عبارتوں کے زیروزبر اور اس کے اسلوب بیان سے جس قدر مولانا علی میاںؒ واقف تھے اور کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وجہ سے مولانا علی میاںؒ ہی کو حضرت رائے پوریؒ نے اس کا اردو ترجمہ کرنے کا حکم فرمایا۔ یہ کتاب کوئی ناول کی طرز کی کتاب نہ تھی، بلکہ اس میں بہت سے حوالہ جات مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابوں اور دوسری کئی

ایک کتابوں سے دیئے گئے تھے ، اور عربی میں کتاب لکھتے وقت مولاناؒ نے وہ تمام اقتباسات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور پڑھے تھے ، لہذا ان اصل عبارتوں کو اصل کتابوں اور اخبارات سے نقل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دوبارہ وہ سب کتابیں فراہم کرنا پڑیں جو اس سے قبل عربی کتاب لکھنے کے لئے فراہم کی گئی تھیں۔ مولانا علی میاںؒ اس بارہ میں لکھتے ہیں :

''اس کتاب (القادیانی والقادیانیة) کے تیار ہو جانے کے بعد حضرت مولانا عبد القادر صاحب مدظلہ کا حکم ہوا کہ اس کا اردو میں ترجمہ بھی کر دیا جائے۔ چونکہ اس ترجمہ میں اصل عبارتوں کو نقل کرنا تھا ۔اس لئے دوبارہ اس پورے کتب خانہ کی ضرورت پیش آئی جو لاہور میں فراہم کیا گیا تھا۔ مناسب سمجھا گیا کہ اس کام کی تکمیل بھی لاہور میں ہو۔ چنانچہ دوبارہ لاہور کا سفر کیا گیا اور الحمد اللہ کہ یہ عربی کتاب اردو میں منتقل ہو گئی ۔ اس کتاب کو ترجمہ کہنے کے بجائے اس موضوع پر مستقل تصنیف کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ عبارتیں (جن کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے) پوری احتیاط کے ساتھ اپنے صحیح مآخذ سے نقل کی گئی ہیں ۔ عربی کے مقابلہ میں کچھ قیمتی اضافے اور بعض مفید ترمیمیں بھی کی گئی ہیں (مقدمہ کتاب قادیانیت ،ص ۹-۱۰)

اس کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کی کتابت ملک کے مشہور خطاط اور حضرت رائے پوریؒ کے ایک ارادت مند حضرت سید انور حسین نفیس رقم سے کروائی گئی اور پھر حضرت رائے پوریؒ ہی کے ایک اور عقیدت مند نے مکتبہ دینیات ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور نے اس کو شائع کیا۔ حضرت رائے پوریؒ نے اس کتاب کی تکمیل اور اشاعت پر بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار فرمایا ، اور بعض مرتبہ ہاتھ میں کتاب کو لے کر حاضر الوقت خدام

واحباب سے فرمایا کہ یہ کتاب خریدو اور پڑھو'' (کاروان زندگی، ۱: ۴۴۹)

کتاب کی اہمیت

کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس کے لکھنے والے کی شخصیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی الندویؒ دنیائے اسلام کی ایک اہم شخصیت تھے۔ آپ نے نہ صرف دنیائے اسلام میں، بلکہ یورپ، کنیڈا اور امریکہ میں بھی اپنی شخصیت اور علمیت کا لوہا منوایا۔ بڑے بڑے عرب علماء آپ کے علم وفضل کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے کونے کونے میں آپ نے اللہ کے دین کا پرچار کیا۔

اذان حرم میں، کلیسا میں، دیر میں ناقوس
کہاں کہاں تیرا عاشق تجھے پکار آیا

آپ کی عربی میں لکھی ہوئی کتابیں عرب جامعات کے شعبہ ادب میں داخل نصاب تھیں جو ان کی ادبی اور علمی ثقاہت پر دال ہیں۔ عربی کے بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز جن کی عالم عربی پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی جیسے استاذ علی طنطاوی، انہوں نے آپ کی کتاب ''مختارات'' کے بارہ میں اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے:

''اگر کسی ادیب کے ذوق کی دلیل اس کا انتخاب ہے، تو قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے کچھ عرصہ ہوا ادبی منتخبات اور نمونوں کے مجموعوں کو جمع کیا تاکہ ان میں سے کسی ایک کو ثانویات شرعیہ کے طلباء کے سامنے رکھیں۔ ہماری کمیٹی کے اراکین نے (جو سب ادباء میں سے تھے) علیحدہ علیحدہ تلاش وجستجو شروع کی اور اس موضوع کی کتابوں کا جائزہ لیا۔ آخر میں ہم سب متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ درسی منتخبات کے مجموعوں میں سب سے بہتر ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ مجموعہ ''مختارات'' ہے جو زبان کے اصناف اور ادب کے متنوع

نمونوں کا سب سے جامع مجموعہ ہے'' (مقدمہ المسلمون فی الہند للشیخ ابی الحسن علی الندوی)

ایسے ادیب کی لکھی ہوئی عربی زبان میں کتاب یقینی بات ہے کہ نہایت اہمیت کی حامل ہوگی، لیکن اگر اس کے علاوہ بھی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں سے یہ کتاب عمدہ اور مستند ہے۔

مرزا کا تعارف

کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تین فصلیں ہیں۔

پہلی فصل میں انیسویں صدی کے ہندوستان کے حالات کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور ان حالات پر بحث کی گئی ہے جن میں مرزا غلام احمد قادیانی اپنی اس نئی دعوت وتحریک کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ دوسری فصل میں مرزا غلام احمد کے خاندانی حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہ حالات اس کی کتابوں اور بیانات سے لئے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ نہ صرف خود مرزا غلام احمد قادیانی، بلکہ اس کا باپ اور بھائی وغیرہ بھی انگریزوں کے نہایت بہی خواہ تھے اور انگریزوں نے ان کی خیر خواہی اور وفاداری کے صلہ میں انہیں سرٹیفکیٹ دیئے تھے۔ چنانچہ مولانا علی میاںؒ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتاب البریۃ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''میں ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا جس کو دربار گورنری سے کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخ رئیسان پنجاب میں ہے۔ اور ۱۸۵۷ میں انہوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی، یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد

میں دیئے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چٹھیات خوشنودی احکام ان کو ملی تھیں، مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہوگئیں، مگر تین چٹھیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں، ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ پھر میرے والد کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدمات سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کے گزرگاہ پر ہندوؤں کا سرکار انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکار انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا (اشتہار واجب الاظہار مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۹۷ء صفحہ ۳ تا ۶ ملحق بکتاب البریہ)

اس اقتباس سے حضرت مولاناؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا خاندان انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا اور انہوں نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا، بلکہ ملت اسلامیہ سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

پھر حضرت مولانا علی میاںؒ نے بتایا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ مدیر اخبار اہل حدیث جو مرزا صاحب کی مخالفت اور ان کے دعاوی کی تردید میں پیش پیش تھے، کے لئے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء میں ایک اشتہار جاری کیا جس میں مولانا کو مخاطب کر کے تحریر کیا:

''اگر میں ایسا ہی کذاب ومفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر ایک پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی اور آخر وہ ذلت وحسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ناکام ہلاک ہو جاتا ہے۔

اور اگر میں کذاب ومفتری نہیں ہوں اور خدا کے مکالمہ ومخاطبہ سے

مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں
کہ سنت اللہ کے موافق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔ پس اگر
وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ خدا کے ہاتھوں سے ہے یعنی
طاعون، ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ
ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں (تبلیغ رسالت، جلد دہم، ص ۱۲۰)

اس اشتہار کے ایک سال بعد ۲۵ مئی ۱۹۰۸ء کو مرزا قادیانی بمقام لاہور، برانڈرتھ روڈ پر بعد عشاء اسہال، یعنی مرض ہیضہ میں مبتلا ہوا اور ۲۶ مئی بروز منگل دن چڑھے مرگیا نعش قادیان بذریعہ ریل لے جائی گئی اور ۲۷ مئی ۱۹۰۸ کو قادیان میں دفن ہوا.

تیسری فصل میں حضرت مولاناؒ نے مرزا قادیانی کے جانشین اور خلیفہ اول حکیم نور الدین کے حالات زندگی بیان کیے ہیں، اور بتایا ہے کہ یہ شخص شروع ہی سے آزاد خیال تھا۔ ابتداء میں یہ سرسید کے خیالات اور طریق سے بہت متاثر ہوا۔ وہ روشن خیالی اور حریت فکر، بلکہ ذہنی بغاوت اس کے اندر رچی بسی تھی، یہاں تک کہ بالآخر اس نے مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا امام و مرشد مان لیا۔ ان کے بارہ میں مرزا قادیانی کا ایک مشہور شعر ہے:

چہ خوش بودے اگر ہر یک امت نوردین بودے
ہمیں بودے اگر ہر دل پر از نور یقین بودے

مرزا صاحب کے تدریجی دعادی

دوسرے باب میں مولانا علی میاںؒ نے مرزا قادیانی کے عقیدہ اور اس کی دعوت کا تدریجی ارتقاء اور دعادی کی ترتیب بیان کی ہے اور بتایا کہ مرزا غلام احمد ایک مصنف اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے میدان میں آیا اور اس نے مسلمانوں کو اس عظیم خدمت اسلام میں مالی امداد دینے اور فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے حصہ لینے کی دعوت دی۔ پھر کچھ

اشتہارات شائع کیے جن میں کسی قدر تجارتی اور کاروباری روح جھلکتی ہے ۔ اس نے مصنف ہونے کے ناطے اپنی پہلی کتاب براہین احمدیہ میں انگریزوں کی منقبت کے قصیدے پڑھے ہیں ۔ اس کتاب میں اپنے کچھ الہامات اور دعا دی بھی ذکر کیے ہیں ، اس کتاب میں اپنی ذات کے بارہ میں وہ بار بار اظہار کرتا ہے کہ وہ دنیا کی اصلاح اور اسلام کی دعوت کے لئے خدا کی طرف سے مامور اور عصر حاضر کا مجدد ہے اور اس کو سیدنا مسیح علیہ السلام سے مماثلث حاصل ہے (سیرۃ المہدی ، جلد ا ، ص ۳۹) ۔ اس کتاب میں اُسے سیدنا مسیح علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور دوبارہ اترنے کا بھی اقرار ہے ۔ خود مرزا قادیانی نے نزول المسیح کے ضمیمہ میں جو ۱۹۰۲ کی تالیف ہے اور براہین احمدیہ کے حصہ پنجم میں جو ۱۹۰۵ء کی تصنیف ہے ، اس بات کا اعتراف اور اس امر پر اظہار تعجب کیا ہے کہ وہ اس وقت تک عقیدہ رفع ونزول مسیح کا قائل تھا ۔ (ضمیمہ کتاب نزول المسیح ، ص ۶ ، براہین احمدیہ ، حصہ پنجم ص ۸۵) ، ۱۸۹۰ء تک مرزا قادیانی نے صرف مجدد و مامور ہونے کا دعویٰ کیا تھا ، اور صرف یہ کہتا رہا '' مجھے اصلاح خلق کے لیے مسیح ناصری کے رنگ میں قائم کیا گیا ہے اور مجھے مسیح سے مماثلت ہے '' (سیرۃ المہدی ، حصہ اول ، ص ۳۹) ۔ پھر ۱۸۹۱ء میں اس نے پہلی بار اپنی تصنیف فتح اسلام میں مثیل مسیح اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا (سیرۃ المہدی ، ج ا ، ص ۲۶۷ ۔ ۲۶۸) ۔ مسیح موعود کے نزول کی جو علامات احادیث نبویہ میں آئی ہیں اب ان میں سے ہر ایک کی اس نے حکیم نورالدین کے مشورہ سے تاویلیں شروع کیں ، جیسے کہ دمشق کی جامع مسجد کے منارۂ شرقی پر نزول کی تاویل وغیرہ ۔

مرزا قادیانی کا دعوی

بالآخر یہ واقعہ پیش آیا ، یہ ۱۹۰۰ء کی بات ہے ، مولوی عبدالکریم سیالکوٹی نے جو مرزا صاحب کی مسجد میں جمعہ کا خطیب تھا ، جمعہ کا خطبہ پڑھا جس میں مرزا کے لیے نبی اور رسول کے الفاظ استعمال کیے ۔ اس خطبہ کو سن کر مولوی سید محمد احسن امروہی نے بہت پیچ

وتاب کھائے ۔مولوی عبدالکریم کو جب سید محمد احسن امروہی کی اس پریشانی کا علم ہوا تو اس نے دوسرے جمعہ کو مرزا صاحب کو مخاطب کر کے کہا: کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو حضور مجھے بتلائیں ، میں حضورؐ کو نبی اور رسول مانتا ہوں ۔ جمعہ کے بعد مرزا نے مولوی عبد الکریم کو کہا۔'' مولوی صاحب ہمارا بھی یہی مذہب اور دعویٰ ہے جو آپ نے بیان کیا ۔ یہ خطبہ سن کر مولوی محمد احسن صاحب غصہ میں بھرے ہوئے واپس آئے اور مسجد کے اوپر ٹہلنے لگے ۔ جب مولوی عبدالکریم صاحب واپس آئے تو مولوی محمد احسن صاحب ان سے لڑنے لگے ۔آواز بہت بلند ہوگئی تو مرزا غلام احمد مکان سے نکلا اور یہ آیت پڑھی'' یا ایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی '' (ماخوذ از تقریر سید سرور شاہ قادیانی ، جلسہ سالانہ قادیان ، مندرجہ ذیل اخبار الفضل ، قادیان جلد ۱۰ نمبر ۵۱ مؤرخہ ۴ جنوری ۱۹۲۳ء ، نیز ملاحظہ ہو حقیقۃ النبوۃ ص ۱۲۴).

اس طرح مولوی عبدالکریم کے اسی اعلان خطبہ سے اس نئے دور کا افتتاح ہوگیا ۔اور مرزا کو معلوم ہوگیا کہ لوگ اب اتنے راسخ الایمان ہو چکے ہیں کہ وہ اس کے ہر دعویٰ کو تسلیم کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ اس روز سے وہ اپنے کو نبی کہلانے لگا ۔ اور لکھا کہ'' پس اس وجہ سے نبی کا نام پانے کے لیے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس کے مستحق نہیں'' (تتمہ حقیقۃ الوحی ، ص ۳۹۱)

مستقل نبوت کا دعویٰ

اور آخر میں اپنے آپ کو محمد اور احمد کہنا شروع کر دیا (ایک غلطی کا ازالہ ، ص ۵) ۔مولانا علی میاںؒ نے مرزا صاحب کی کتاب اربعین نمبر ۴ ، ص ۷ کے حوالہ سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مرزا نے مستقل نبوت اور صاحب شریعت نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہوا تھا کیونکہ مرزا نے لکھا ہے کہ اپنے ماننے والوں کی تکفیر کرنا صرف صاحب شریعت نبیوں کا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

''یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعویٰ سے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں، لیکن صاحب شریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور محدث ہیں، گو وہ کیسے ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعت مکارم الٰہیہ سے سرفراز ہوں ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن سکتا'' (تریاق القلوب، ص ۱۳۰ حاشیہ)

دوسروں کو تکلیف

اب مولانا علی میاںؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا نے اپنی مختلف کتابوں میں اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہا ہے اور یہی بات قادیانی جماعت کے خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی کتاب آئینہ صداقت، صفحہ نمبر ۳۵ پر کہی ہے کہ مرزا کو نہ ماننے والے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

پھر مولانا علی میاںؒ نے یہ ثابت کیا کہ غیر احمدی مسلمانوں کو کافر سمجھنے کی بنیاد پر مستند قادیانی جماعت نے ان پر کفار کے تمام فقہی احکام جاری کیے۔ چنانچہ قادیانیوں کو ممانعت ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات رکھیں۔ اسی طرح ان کے پیچھے نماز پڑھنا بھی درست نہیں (اربعین نمبر ۳ ص ۴ حاشیہ)۔ اسی طرح ان کی نماز جنازہ پڑھنے کی بھی ممانعت ہے۔ چنانچہ اخبار الفضل ۱۵ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہے کہ ''حضرۃ مرزا صاحب نے اپنے بیٹے (فضل احمد مرحوم) کا جنازہ اسی لیے نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا۔ اسی لیے چوہدری ظفر اللہ خان نے (جو پاکستان کا وزیر خارجہ تھا) بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا جنازہ نہیں پڑھا، حالانکہ وہ اس جنازہ میں موجود تھا۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے قادیانی ہونے سے پہلے فرض حج ادا کیا اور بعد میں وہ قادیانی ہو گیا تو اس کا وہ حج فرض ادا نہیں ہوا (اخبار الحکم، قادیان ۷ مئی ۱۹۳۴ء)

نبوت اور کمالات نبوت کے بارہ میں مرزا کا احساس برتری جو ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے، اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ اول تو خود کو تمام انبیاء کا ہم پلہ اور ہم چشم سمجھتا تھا اور پھر اپنے کو جامع کمالات انبیاء سمجھنا لگا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس کا عقیدہ اور اعلان ہے کہ اس سے نسل آدم کی تکمیل ہوئی اور اس کے بغیر یہ گلشن انسانیت ناتمام ہے۔ اس کا شعر ہے

روضۂ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک
میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ وبار

مرزا قادیانی کی عیش وعشرت کی زندگی

کتاب کے تیسرے باب میں مولانا علی میاںؒ نے مرزا قادیانی کی دعوت کے فروغ اور رجوع عام کے بعد کی زندگی پر تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کی تاریخ دعوت وتجدید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے زمانہ میں دینی اصلاح کے علم بردار تھے اور جن کو خدا نے حلاوت ایمانی سے شادکام کیا، ان کو جس قدر مرجعیت حاصل ہوئی اور جس قدر ان کے لیے فارغ البالی اور آسودہ زندگی کے اسباب مہیا ہوئے، اسی قدر ان میں زہد کا جذبہ، ایثار وقناعت کا جوش اور دولت وامارت سے وحشت اور آخرت کا شوق بڑھا۔ ان کی ساری زندگی اس یقین اور اصول کے تحت تھی کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ مرزا قادیانی نے بھی حضورؐ کی زندگی اسی طرح بتائی (ملاحظہ ہو براہین احمدیہ، حصہ اول، ص ۱۱۷)، لیکن مرزا صاحب کی خانگی زندگی جس ترفہ اور جیسے تجمل اور تصنع کی تھی، وہ راسخ الاعتقاد متبعین کے لیے بھی ایک شبہ اور اعتراض کا موجب بن گئی تھی۔ اس بارہ میں مولاناؒ نے خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی لاہوری کے اعتراضات نقل کیے (ملاحظہ ہو مرزا بشیر الدین محمود کا خط بنام حکیم نور الدین، مندرجہ حقیقۃ الاختلاف، مصنفہ مولوی محمد علی لاہوری صفحہ ۵۰)

پھر مرزا قادیانی کی زندگی میں ہی قادیان کے بہشتی مقبرہ'' میں جگہ پانے کے لیے جو شرائط وضع کی گئیں اور ایک قبر کے لیے جو گراں قدر رقیمت اور نذرانہ رکھا گیا اور اس کا جس ترغیب اور تشویق سے اعلان کیا گیا (ملاحظہ ہو مرزا صاحب کا رسالہ الوحی صفحہ ۱۱۔۲۳) اس سے قرون وسطیٰ کے ارباب کلیسا اور پوپوں کے '' پروانہ غفران'' یعنی معافی نامہ کے بیع وشراء اور جنت کی قبالہ فروشی کی یاد تازہ کر دیتی ہے، بلکہ ان کو شرما دیتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ ''الفضل'' قادیان نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا تھا۔

''مقبرہ بہشتی اس سلسلہ کا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے اور ایسا عظیم الشان انسٹی ٹیوشن یعنی محکمہ ہے جس کی اہمیت ہر دوسرے محکمہ سے بڑھ کر ہے

(اخبار الفضل قادیان، جلد نمبر ۲۴، مؤرخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۶ء)

مال کی اس بہتات اور قادیان اور ربوہ کی ریاستوں کے صدر نشین ان کو سب اختیارات اور عیش کوشی کے وہ سب مواقع مہیا ہیں جو اس زمانے کے کسی بڑے سے بڑے انسان اور عیاش کو ہو سکتے ہیں۔

انگریزوں کی تائید وحمایت

۱۹۵۷ء سے پہلے ہی برصغیر پاک وہند میں انگریزی تسلط قائم ہو چکا تھا اور مسلمان حکمرانوں کے جانشین انگریزوں کے وظیفہ خوار ہو گئے تھے ان لوگوں کا اب سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا، بلکہ ملک کی بساط سیاست کے اصل شاطر اب انگریز تھے۔ انگریزوں نے اب پادریوں کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی (جس کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''اسلام کی دعوتی قوت، باب عیسائیت کی یلغار)۔ اسلام اور اس کی تعلیمات کا مضحکہ اڑایا جانے لگا۔ اسلام کی اجتماعی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور مغربی تہذیب نے مسلمانوں کے گھروں اور ان کے دل ودماغ پر چھاپہ مارا۔ ان سب کے ردعمل کے طور پر ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ظہور میں آیا جس میں علم

بغاوت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ انگریز اس میں کامیاب ہوئے اور یہ ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظام سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت ہو گیا۔

زخم خوردہ فاتحین نے اب باغی مسلمانوں سے سخت انتقام لیا۔ ان کو بے عزت کیا۔ ان کے علماء، صلحاء، رؤساء اور شرفاء کو تختہ دار پر لٹکایا۔ ان کے اسلامی اوقاف ضبط کر لیے اور ان پر شریفانہ ملازمت کے دروازے یک قلم بند کر دیے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی کتاب Our Indian Mussalmans اور سرسید احمد خان کی کتاب، اسباب بغاوت ہند)۔

انگریز اس ملک میں نہ صرف ایک ناخدا ترس فرماں روا اور جابر حاکم تھے، بلکہ وہ اک ایسی تہذیب کے بھی علم بردار تھے جو ان تمام اقدام کے خلاف تھی جن پر اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی نظام کی بنیاد ہے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ قرآن وسنت اور انبیاء مرسلین کے اسوۂ حسنہ کے مطابق تعاون اور ان کی حکومت کی پختگی (Stablity) کے لیے کسی قسم کی کوشش کرنا یا ان کی تائید وتعریف میں رطب اللسان ہونا جائز نہیں، لیکن اس کے برعکس مرزا غلام احمد قادیانی نے، جس کا دعویٰ مرسل من عند اللہ اور مامور من اللہ ہونے کا تھا، انگریزوں کی تحسین وتعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیے، وہ انگریزوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے جو ایک بے ضمیر انسان کی شایان شان ہے۔ اس نے انگریز کی تعریف وتوصیف میں اس قدر کتابیں لکھیں کہ ایک وسیع کتب خانہ تیار ہو جاتا ہے۔ اس بارہ میں مولاناؒ نے کئی عبارات نقل کی ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔ مرزا غلام احمد اپنی کتاب تریاق القلوب میں انگریزی تائید وحمایت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ''میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید وحمایت میں گذرا اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اس

سے بھر سکتی ہیں ۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب مصر، شام، کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے ۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں'' (تریاق القلوب ص ۱۵)۔

اپنی کتاب شہادت القرآن کے آخر میں لکھتے ہیں:

''میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے، دوسرے اس سلطنت کی جس نے امن قائم کیا ہو، جس نے ظالموں کے ہاتھوں سے اپنے سائے میں پناہ دی ہو، سو وہ سلطنت حکومت برطانیہ ہے''

(اشتہار گورنمنٹ کی توجہ کے لائق، مندرجہ شہادۃ القرآن)

اپنی ایک اور عربی کتاب میں مرزا قادیانی نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''اس کا وجود انگریزی حکومت کے لئے ایک قلعہ اور حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے'' (نور الحق عربی ص ۳۴)

۲۲ فروری ۱۸۹۸ء میں مرزا قادیانی نے ایک درخواست لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو پیش کی جس میں اپنے آپ کو خود کاشتہ پودا کہا۔ چنانچہ لکھتا ہے:

''یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار، جان نثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رویئے سے اپنی چٹھیاں میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم زمانے

سے انگریزوں کے خیرخواہ اور خدمت گزار ہے، اس ''خود کاشتہ'' پودے کی نسبت نہایت حزم واحتیاط اور تحقیق وتوجہ سے کام لے، اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت ومہربانی کی نظر سے دیکھیں'' (تبلیغ رسالت، جلد ۷، ص ۱۹)

مرزا غلام احمد قادیانی نے جس طریقہ سے انگریزوں اور ان کی حکومت کی تعریف کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک انگریزی حکومت ایک ''سایہ الٰہی'' اور ''دولت دین پناہ'' تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز ان کی یہ حکومت نہ صرف ہندوستان سے کوچ کر جائے گی بلکہ پوری دنیا سے ان کے اقبال کا ستارہ غروب ہو جائے گا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے جس جوش کے ساتھ مسلمانوں کو محکومی اور غلامی کی زندگی کو نعمت سمجھنے کی تلقین کی، یہ اس کے اس منصب کے یک قلم خلاف ہے جس کا وہ مدعی تھا۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے ان اشعار میں اسی کے بارے میں کہا ہے۔

شیخ اولد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقام بایزید
گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولت اغیار را رحمت شمرد
رقص گرد کلیسا کرد و مرد (انجام آتھم، ص ۲۸۱۔۲۸۲)

مرزا قادیانی کی دشنام طرازی

تیسرے باب کی تیسری فصل میں مولانا علی میاںؒ نے مرزا صاحب کی درشت

کلامی اور دشنام طرازی پر مختصر بحث کی ہے کیونکہ مرزا قادیانی جس منصب کا مدعی تھا اس منصب کے لوگ ایسی زبان کبھی بھی استعمال نہیں کرتے ۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نہایت شیریں کلام، پاکیزہ زبان، عالی ظرف اور صابر و متحمل ہوتے ہیں ۔ وہ سلام کا جواب سلام سے، بددعا کا جواب دعا سے، تکبر کا جواب عاجزی اور فروتنی سے اور رذالت کا جواب شرافت سے دیتے ہیں ۔ طنز وتعریض، ہجو ملیح اور ضلع جگت وغیرہ سے ان کی فطرت عالی کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی ۔ وہ کسی کے حسب ونسب پر حملہ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے خاندان اور آباء واجداد پر الزام لگاتے ہیں اور نہ ہی درباری شاعروں اور لطیفہ گویوں کی طرح چٹکی لینے اور فقرہ چست کرنے کے فن سے آشنا ہوتے ہیں ۔ ان کا کلام ہر موقع پر ان کی سیرت وفطرت کی طرح پاکیزہ اور متوازن ہوتا ہے ۔ خود مرزا قادیانی کو بھی اس بات کا اقرار ہے کہ جو لوگ پیش گوئی، امامت اور دینی عظمت کے مرتبہ سے سرفراز ہوں، ان میں صبر وتحمل، ضبط نفس اور عفو وحلم کی صفات کا پایا جانا ضروری ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

''چونکہ اماموں کو طرح طرح کے اوباش، سفلوں، اور بدزبان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس لیے ان میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقی قوت کا ہونا ضروری ہے تاکہ ان میں طیش نفس اور مجنونانہ جوش پیدا نہ ہو، اور لوگ ان کے فیض سے محروم نہ رہیں ۔ یہ نہایت قابل شرم بات ہے کہ ایک شخص خدا کا دوست کہلا کر پھر اخلاق رذیلہ میں گرفتار ہو اور درست بات کا ذرا بھی متحمل نہ ہو سکے ۔ اور جو امام زماں کہلا کر ایسی کچی طبیعت کا آدمی ہو کہ ادنیٰ بات میں منہ میں جھاگ آتا ہے، آنکھیں نیلی پیلی ہوتی ہیں، وہ کسی طرح سے امام زمان نہیں ہوسکتا'' (ضرورۃ الامام، ص ۸)

لیکن اس کے برعکس مرزا قادیانی نے اپنے مخالفین کو دشنام آمیز الفاظ میں یاد کیا ہے کہ بار بار تہذیب کی نگاہیں نیچی اور حیاء کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے ۔ اپنے مخالفین

کے لیے ''ذریۃ البغایا'' (رنڈیوں اور بدکار عورتوں کی اولاد) کا کلمہ تو ان کے لئے تکیہ کلام ہے

(ملاحظہ ہو آئینہ کمالات اسلام، ص ۵۴۷؛ نور الحق حصہ اول ۲۳؛ انجام اتھم، ص ۲۸۲)

ایک کتاب میں اپنے مخالفین کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے۔

ان العدیٰ صاروا خنازیرا الفلا

ونسائھم من دونھن الاکلب

ہمارے دشمن بیابانوں کے خنزیر ہو گئے ہیں اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئی ہیں۔

انہوں نے اپنے ایک اور حریف مولوی سعد اللہ لدھیانوی کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے کہ ان شعروں کا ترجمہ کرنے سے قلم بھی معذرت کرتا ہے۔ انہوں نے تین شعروں میں گیارہ بارہ گالیاں دی ہیں:

ومن اللئام اری رجیلا فاسقاً	غولا، لعیناً، نطفۃ السفھاء
شکس، خبیث، مفسد ومزورّ	نحس یسمیٰ السعد فی الجھلاء
آذیتنی خبثا فلست بصادق	انی لم تمت بالخزی یا بن بغاء

(انجام آتھم، ص ۲۸۱۔۲۸۲)

پھر برصغیر پاک و ہند کے جس قدر بڑے بڑے علماء اور اعاظم رجال تھے، ان کے لیے اس نے رذائل وکلاب، شیطان لعین، شیطان اعمیٰ، غول اغویٰ اور شقی وملعون کے الفاظ استعمال کیے ہیں (انجام آتھم، ص ۲۵۱۔۲۵۲)

حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ کو اپنی کتاب اعجاز احمدی، ص ۵۷۔۷۶ میں ''ملعون'' کہا گیا۔ ان مطاعن سے بھی اس کی پر جوش طبیعت کو تسکین نہیں ہوتی تو وہ بعض مواقع پر مخالفین پر لعنت کرتے ہوئے لعنت کی تعداد کو کسی ایک ہندسہ میں ظاہر کرنے کی بجائے لفظ لعنت کو علیحدہ علیحدہ لکھتا ہے۔ چنانچہ ضمیمہ نزول المسیح میں حضرت مولانا

ثناء اللہ صاحبؒ کے لیے دس مرتبہ لعنت کا لفظ لکھا ہے اور نور الحق ص ۱۲۱ تا ۱۲۵ میں عیسائیوں کے لئے ایک ہزار بار لعنت کا لفظ لکھا ہے۔ یہ لعنت نامہ اس کی پُر جوش طبعیت کا عجیب مرقع ہے۔ ایک اور کتاب میں اس نے اپنے مخالف علماء کو مجموعی طور پر مخاطب کر کے کہا: اے بد ذات فرقہء مولویاں! تم کب تک حق کو چھپاؤ گے۔ (انجام آتھم، حاشیہ ص، ۲۱)

مولانا علی میاںؒ نے اس فصل میں مرزا قادیانی کے بہت کم حوالے نقل کیے ہیں۔ وگرنہ اس پر ''مغلظات مرزا'' کے عنوان سے ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، چنانچہ مولاناؒ چند حوالے لکھ کر فرماتے ہیں:

''یہ موضوع نہ تو محرر سطور کے لیے خوشگوار ہے نہ قارئین کتاب کے لئے دلچسپ ومرغوب اس لئے ہم انہیں چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

محمدی بیگم کی پیش گوئی، جو پوری نہ ہوئی

اس باب کی چوتھی فصل میں مولانا علی میاںؒ نے محمدی بیگم کی پیش گوئی کا ذکر کیا ہے۔ ویسے تو مرزا قادیانی کی کوئی پیش گوئی بھی پوری نہیں ہوئی۔ لیکن اس پیش گوئی کے بارہ میں مرزا قادیانی نے اپنے ایک اشتہار میں جو ۱۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو شائع اور تقسیم ہوا جس میں یہ بتایا کہ مرزا احمد بیگ کی دختر کلاں تمہارے نکاح میں آئے گی۔ اگر اس کے والد نے نکاح سے انحراف کیا تو اس لڑکی کا انجام نہایت ہی برا ہوگا۔ اور جس کسی دوسرے شخص سے وہ بیاہی جائے گی وہ روز نکاح سے اڑھائی سال تک اور ایسا ہی والد اس دختر کا تین سال تک فوت ہو جائے گا، اور اس کے گھر میں تفرقہ اور تنگی اور مصیبت پڑے گی (آئینہ کمالات اسلام، ص ۲۸۶، تبلیغ رسالت حصہ اول ص ۱۱۱)

اس پیش گوئی کو مرزا قادیانی نے اپنا صدق وکذب جانچنے کا معیار قرار دیا،

چنانچہ لکھتا ہے:

''یہ خیال لوگوں کو واضح ہو کہ ہمارا صدق یا کذب جانچنے کے لئے ہماری پیش گوئی سے بڑھ کر اور کوئی محک امتحان نہیں'' (آئینہ کمالات اسلام، ص ۲۲۸۸)

اس پیش گوئی کو مولانا علی میاںؒ نے تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن نہ تو محمدی بیگم اس کے نکاح میں آئی اور نہ ہی اس کا خاوند اڑھائی سال کی مدت میں مرا، مرزا قادیانی لکھتا ہے۔

''میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیش گوئی داماد احمد بیگ (سلطان محمد) کی تقدیر مبرم ہے، اس کی انتظار کرو۔ اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہو گی اور میری موت آجائے گی'' (انجام آتھم ص ۳۱ حاشیہ)۔

ساری دنیا نے دیکھا کہ مرزا قادیانی ۱۹۰۸ء میں مر گیا اور یہ نکاح جو بقول اس کے آسمان پر ہو چکا تھا زمین پر نہ ہو سکا، لیکن راسخ عقیدہ قادیانیوں کے لیے جب تک نسل انسانی کا سلسلہ باقی ہے، اس پیش گوئی کی تحقق کا امکان ہے، حکیم نورالدین بھیروی نے اس کی عجیب تقریر کی:

''اب وہ تمام اہل اسلام کو جو قرآن کریم پر ایمان لائے اور لاتے ہیں، ان آیات کا یاد دلانا مفید سمجھ کر لکھتا ہوں کہ جب مخاطبت میں مخاطب کی اولاد اور مخاطب کے جانشین اور اس کے مماثل داخل ہو سکتے ہیں تو احمد بیگ کی لڑکی (محمدی بیگم) یا اس کی لڑکی کی لڑکی کیا داخل نہیں ہو سکتی، اور کیا آپ کے علم فرائض میں بنات البنات (لڑکیوں کی لڑکیاں) کو حکم بنات نہیں مل سکتا، اور کیا مرزا کی اولاد

مرزا کی عصبہ نہیں ۔ میں نے تو بارہا عزیز میاں محمود کو کہا کہ اگر حضرت (مرزا صاحب) کی وفات ہو جائے اور یہ لڑکی نکاح میں نہ آوے تو بھی میری عقیدت میں تزلزل نہیں آسکتا۔'' (ریویو آف ریلجز، قادیان، جلد ۷ نمبر ۶۲۷، ماہ جون و جولائی ص ۱۹۰۸ء ص ۲۷۹)

قادیانیت کا تنقیدی جائزہ

کتاب کے چوتھے باب میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے قادیانیت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اور سب سے پہلے ان لوگوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کو امت مسلمہ کے مذہبی فرقوں میں سے ایک فرقہ سمجھتے ہیں ۔ حضرت مولاناؒ نے یہ بتایا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں، اور خود مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی اپنے ماننے والوں کو امت مسلمہ سے الگ ایک متوازی امت کہا ہے ۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود نے لکھا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا:

''یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم ﷺ، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک جزو میں ہمیں ان سے اختلاف ہے'' (خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود، مندرجہ اخبار الفضل، قادیان، مؤرخہ ۳ جولائی ۱۹۳۱ء).

اور یہ کہ

''حضرت خلیفہ اول نے اعلان کیا تھا کہ ان (مسلمانوں) کا اسلام اور ہے اور ہمارا اور ہے'' (اخبار الفضل، مؤرخہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء)

یہی وجہ سے قادیانیت اسلام کے دینی نظام، اور زندگی کا نیا ڈھانچہ پیش کرتی ہے اور دینی زندگی کے تمام شعبوں اور مطالبوں کی بطور خود خانہ پری کرنا چاہتی ہے اور اپنے پیروؤں کو جدید نبوت، جدید مرکز محبت وعقیدت، نئی دعوت، نئے روحانی مرکز اور مقدسات، نئے مذہبی شعائر، نئے مقتداء، نئے اکابر، اور نئے تاریخی شخصیتیں عطا کرتی ہے، گویا وہ قلب ونظر اور فکر واعتقاد کا نیا مرکز قائم کرتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کو ایک مذہبی اور فقہی وکلامی مکتب خیال سے زیادہ ایک مستقل مذہب، متوازی امت اور ایک مستقل نظام زندگی کی شکل عطا کرتی ہے۔ اس کے فکر واعتقاد کا مرکز الگ ہے۔ اس کی زندگی میں قدیم دینی مرکزوں، اداروں اور شخصیتوں کی جگہ جدید دینی مرکز اور ادارے اور شخصیتیں آجاتی ہیں اور وہ ایک نئی امت بن جاتے ہیں۔ انفرادیت اور تقابل کا یہ رجحان قادیانیت کے اندر شروع سے کام کر رہا ہے اور وہ بلوغ وپختگی کے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ اب حالت یہ ہے کہ قادیانی بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اسلامی شعائر کے ساتھ قادیانی شعائر کا مقابلہ کرتے ہیں، مثال کے طور پر صحابہ کرامؓ کو اسلام کے دینی نظام میں ایک مقام حاصل ہے، لیکن قادیانی مرزا قادیانی کے ہم نشینوں اور رفقاء کو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ ہی کا درجہ دیتے ہیں، چنانچہ اخبار الفضل میں ایک ذمہ دار قادیانی نے لکھا:

> ''ان دونوں گروہوں (صحابہ رسولؐ اور مرزا غلام احمد قادیانی کے ہم نشین) میں تفریق کرنی یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں، یہ دونوں فرقے درحقیقت ایک ہی جماعت میں ہیں۔ صرف زمانہ کا فرق ہے وہ بعثت اولیٰ کے تربیت یافتہ ہیں اور یہ بعثت ثانیہ کے'' (اخبار الفضل قادیانی مؤرخہ ۸ مئی ۱۹۱۸ء)۔

اسی طرح امت مسلمہ کے اپنے آپ کو متوازی بنانے کے لیے مرزا غلام احمد کی

قبر کو مرقد رسول ﷺ اور گنبد خضراء کا مماثل بتایا۔ چنانچہ اخبار الفضل میں ان شرکائے جلسہ کی دینی بے حسی اور بد ذوقی کی شکایت کرتے ہوئے جو قادیان آنے کے باوجود مرزا صاحب کی قبر پر حاضری نہیں دیتے۔ لکھا ہے:

''کیا حال ہے اس شخص کا جو قادیان دارالامان میں آئے اور دو قدم چل کر مقبرہ بہشتی میں حاضر نہ ہوا۔ اس میں وہ روضہ مطہرہ ہے جس میں اس خدا کے برگزیدہ کا جسم مبارک مدفون ہے، جسے افضل الرسل نے اپنا سلام بھیجا اور جس کی نسبت حضرت خاتم النبیین نے فرمایا۔ **یدفن معی فی قبری** ۔ اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے گنبد خضراء کے انوار کا پورا پورا پرتو اس گنبد خضراء پر پڑ رہا ہے، اور آپ گویا ان برکات سے حصہ لے سکتے ہیں جو رسول ﷺ کے مرقد منور سے مخصوص ہیں، کیا ہی بدقسمت ہے وہ شخص جو احمدیت کے حج اکبر میں اس تمتع سے محروم رہے'' (اخبار الفضل قادیان، جلد ۱۰ ص نمبر ۴۸)

خود مرزا غلام احمد قادیانی نے قادیان کو سرزمین حرم سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہا۔

زمین قادیاں محترم ہے ہجوم خلق سے ارض حرم ہے

(درثمین ص ۵۲)

ان کے نزدیک ''قادیان'' کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے۔

ان سب اعتقادات اور بیانات کا منطقی اور طبعی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس کے لیے سال بسال حاضر ہونے کو حج ہی کا سا ایک مقدس عمل، بلکہ ایک طرح کا حج سمجھا جانے لگا، چنانچہ قادیانیوں کے رہنماؤں اور ذمہ داروں نے سفر قادیان کو ظلی حج کا لقب دیا ہے

اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو خانہ کعبہ کے حج کو نہ جاسکیں حج اسلام کا ''حج بدل'' قرار دیا ہے۔ پھر اس بارے میں اتنا غلو ہونے لگا کہ قادیان کے سفر کو حج بیت اللہ پر ترجیح دی جانے لگی اور یہ اس ذہنیت کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے کہ قادیانیت ایک زندہ اور جدید مذہب اور اس کا مرکز ایک زندہ اور جدید مذہب کا روحانی مرکز ثقل ہے۔ اسی وجہ سے ایک قادیانی بزرگ نے کہا کہ

> ''جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے وہ خشک اسلام ہے۔ اسی طرح اس حج ظلی کو چھوڑ کر مکہ والا حج رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں پر آج کل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے'' (اخبار پیغام، صلح جلد، ۲۱ص نمبر ۲۲)

قادیانیت میں علیحدگی کا رجحان کچھ اس قدر بڑھ گیا کہ ان لوگوں نے اپنی نئی تقویم کی بنیاد بھی ڈال دی اور اسلامی مہینوں کے علاوہ سال کے نئے ناموں سے تاریخ لکھنے لگے، چنانچہ الفضل میں مہینوں کے جو نام چھپنے لگے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

صلح، تبلیغ، امان، شہادت، ہجرت، احسان، وفا، ظہور، تبوک، اخاء، نبوت، فتح۔

قادیانیت مدنی نہیں، بلکہ ہندوستانی مذہب ہے

ملت اسلامیہ سے علیحدگی کے ان رجحانات کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مذہب قادیانیت، کا ذہنی، روحانی اور سیاسی مرکز بجائے جزیرۂ عرب اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قادیان اور ربوہ موجودہ چناب نگر بننے لگا جو اس نئے مذہب کے ظہور کا مرکز تھا۔ اس بات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں کی وابستگی عرب وحجاز سے دن بدن کم ہوتی چلی گئی اور ان کی ساری توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز ہندوستان میں محدود ہو کر رہ گیا، کیونکہ اسی سرزمین سے یہ تحریک اُٹھی، اسی میں اس کا بانی اور داعی دعوت دیتا رہا اور پھر اسی زمین

میں مرکر وہ دفن ہوا.

قادیانیت کے اس مزاج اور اس کے اس رخ کا ہندوستان کے قوم پرستوں نے پُر جوش خیر مقدم کیا کیوں کہ انہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ پرانی شکایت ہے کہ ان کی اصل وابستگی ہندوستان سے نہیں بلکہ سرزمین حجاز سے ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے اس قوم پرست عناصر نے قادیانیت کا اس حیثیت سے پر جوش استقبال کیا ہے، چنانچہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے اس بارہ میں ایک ہندو مضمون نگار ڈاکٹر شنکر داس کا مضمون نقل کیا ہے جس نے قادیانوں کے اس جذبہ اور مزاج کو سراہا ہے، (بندے ماترم مؤرخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۲ء)

قادیانیت نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت

اس باب کی دوسری فصل میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے کھل کر بات کی ہے کہ قادیانیت دراصل نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت ہے کیوں کہ عقیدۂ ختم نبوت اور یہ عقیدہ کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے، ایک انعام خداوندی اور موہبت الٰہی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو عالم اسلام کے وسیع ترین رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اُٹھاتی ہیں۔ اسی عقیدہ نے اسلام کو مدعیان نبوت کا، بلکہ منحرفین اسلام کا بازیچہ اطفال بننے سے محفوظ رکھا جو تاریخ کے مختلف وقفوں اور عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے۔ ختم نبوت کے اسی حصار کی وجہ سے ملت اس لوگوں کی دست برد اور یورش سے محفوظ رہی، جو اس کے ڈھانچے کو بدل کر نیا ڈھانچہ بنانا چاہتے تھے.

اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اُٹھیں، وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظام حکومت کے خلاف تھیں یا شریعت اسلامی کے خلاف، لیکن قادیانیت درحقیقت نبوت محمدی

کے خلاف ایک سازش ہے اور امت کی وحدت اور ابدیت کو ایک چیلنج ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کا ایک مضمون انگریزی اخبار (State,sman) میں شائع ہوا تھا جس میں قادیانیت کی اس جسارت کو واضح کیا ہے، علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدانیت پر ایمان' انبیاء پر ایمان اور رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملّت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں' مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، لیکن انہیں ملّت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا، لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا، لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملّت کے رسول کریمؐ کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے کی ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں

(حرف اقبال، ص ۱۳۶۔۱۳۷)

''مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں، چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو، لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے''۔

(قادیانی اور جمہور مسلمان، حرف اقبال ص ۱۲۲۔۱۲۳)

مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک اور جدوجہد کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ نبوت کی حرمت وعظمت اور اس منصب کی آبرو اور شرف اٹھ جائے۔ انہوں نے نبوتا زیچہ اطفال بن جائے۔ وہ اگرچہ نبوت کے اجراء وتسلسل کی تقریر محض اپنی نبوت کے امکان ثبوت کے لیے کرتے ہیں (تسلسل کے بعد یہ عبارت چھوڑ دی ہے، اور درمیان میں دوسری عبارت لے آئے ہیں) اور ختم نبوت کا انکار محض اپنی حد تک ہے، ورنہ آنے والوں کے لیے وہ اپنے ہی کو خاتم النبیین سمجھتے ہیں (ملاحظہ ہو خطبہ الہامیہ ص ۱۱۲)

غرض کہ حضرت مولانا علی میاںؒ نے عربی اور اردو میں دو کتابیں لکھیں اور جس سنجیدگی اور دلائل وترتیب سے لکھیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ زبان وہ استعمال کی جو مخالف کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور اس کو کسی قسم کے اعتراض کا کوئی موقع نہ ملے کہ ہمارے بارہ میں نازیبا اور ناشائستہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ اسلوب بیان ایسا کہ مخالف بھی کتاب پڑھنے پر مجبور ہو۔ دلائل ایسے کہ جن کا جواب کوئی نہیں، ہر بات باحوالہ اور ہر اقتباس مرزا صاحب یا ان کے پیروکاروں کی کتابوں سے۔ اس وجہ سے یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور برصغیر پاک وہند، جدہ، مدینہ منورہ، کویت، اور بیروت سے ہزاروں

لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں پہنچ چکی ہے۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ ردّ قادیانیت پر جتنی اس کتاب کی نہ صرف عرب دنیا میں، بلکہ دوسرے ممالک میں بھی جتنی پذیرائی اس کتاب کی ہوئی، اور کسی کتاب کی نہیں ہوئی تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری چیئر مین ادارہ تحقیقات اسلام آباد نے کیا اور انڈونیشی اور افریقی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔

☆.....☆